دورِ حاضراوراقبال-ایک نئی جہت

ڈاکٹر شاہد اقبال کامران*

Abstract:

This article puts forth a discussion about the Iqbal's declare war" against present age in the light of "Zarb-e-Kaleem" the writer of the article stimulate the significance and importance of this declaration in our age. In his views the issues and the problems like capitalism, terrorism, imperialism, colonialism, conflict between Islam and west. Conservative Maulvies or Mullah etc facing our age, were also present iqbal's era. Iqbal believe in dialogue instead of clash and conflict. In-fact iqbal's declaration "of war" is for the abolition of exploitation. This article highlights these aspects of discussions and emphasis on this point that iqbal's thought is a basic need for our age particularly Muslim world.

بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے وسط میں منظر عام پر آنے والے اقبال کے اُردو مجموعہ کلام 'ضرب کلیم' کے سرورق پر ایک اعلان درج ہے 'اعلان جنگ' دور حاضر کے خلاف، اس اعلان میں ابلاغ کا ایک جہانِ معانی آباد ہے۔ یہ مجموعہ کلام اپنے متنوع لیکن مرتب و منظّم مشمولات کی نوعیت اور معنویت کے اعتبار سے حد درجہ منفرد، ممتاز اور اقبال کے فلسفہ سیاست و ریاست و مذہب و معاشرت کا عمدہ اظہار بھی ہے اور اس سوال کا موضوع بھی کہ آخر دور حاضر کے وہ کون سے پہلو اور عصری رجحانات کی وہ کونسی جہات ہیں جن کے خلاف اقبال نے اعلان جنگ کرنے کی ضرورت محسوس کی اور اس جنگ کے لیے وہ ضرب کلیم کو ضروری خیال کر رہے ہیں۔

اسی تناظر میں یہ سوال بھی اہم ہے کہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے وسط اور اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کے اواخر کے معاملات و مسائل میں کیا اشتراکات پائے جاتے ہیں؟ اور یہ کہ اقبال کا وہ اعلان جنگ دور حاضر

* صدر شعبہ اُردو و اقبالیات، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

میں ہمارے لیے کس قدر معنویت رکھتا ہے؟ تاریخ کے حوالے سے کیے گئے تجزیاتی مطالعات میں اہم ترین امر یہ ہے کہ تغیر، تبدیلی اور تحرک کی لازمی، منہ زور، شدید اور بعض اوقات انسانی ارادوں کے لیے حوصلہ شکن رفتار اور اس کے رخ کا صحیح صحیح اندازہ قائم کیا جائے۔ اگر ہم اس امر کو نظر انداز کریں گے اور تاریخ کو ایک جامد اور اپنے عمل اور ردعمل کے اعتبار سے یکساں خیال کرتے ہوئے تجزیہ کرنے کی کوشش کریں گے تو غالب امکان یہ ہے کہ درست نتائج تک پہنچنا دشوار ہو جائے۔ ایک صدی پہلے اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے اقبال کی تشویش کا باعث بننے والے امور میں سرفہرست دین کی نمائندگی کرنے والے مولوی حضرات اور بعض علماء کی نادانی، بے خبری، کم علمی اور اس کا پیدا کردہ تصور اسلام تھا۔ اقبال اس تصور اسلام کا بار ہا نشانہ بھی بنے اور تکفیر کے فتوؤں کی زد میں آئے۔ مسلمانوں کی سیاسی محکومی بھی اقبال کے لیے باعث تشویش تھی ایک اور بڑا مسئلہ مسلمانوں کی عملی زندگی میں اسلام کے مقام و کردار اور معنویت کا تھا اور یہ بنیادی مسئلہ بھی تھا۔ اقبال عالم عرب میں فرنگی تخیلات کے زیر اثر قوم پرستی کے خطرناک اور ملت شکن رجحان اور اس کے لازمی نتائج سے بھی آزردہ تھے۔ 'بیچتا ہے ہاشمی ناموس دینِ مصطفیٰ' اسی آزردگی کا اظہار ہے اور سب سے بڑھ کر اقبال کی تشویش کا باعث سر سے لے پیر تک اسلحے میں غرق مغرب کی فکری اور عملی دہشت گردی تھی کہ بیسویں صدی میں جس کا بڑا نشانہ ترکی کی سلطنت بنی۔ گویا بیسویں صدی کے اوائل میں مسلمانانِ عالم بلا امتیاز سر سے لے کر پیر تک اسلحے میں غرق مغرب کی ہمہ جہت دہشت گردی کا شکار تھے۔ اس وقت دہشت گردی کی یلغار سے مسلمانوں کے اجتماعی وجود کو اسلام نے بچالیا تھا۔ اکیسویں صدی کے اوائل میں دہشت گردی کی اس جنگ میں مسلمانوں کے ساتھ اسلام بھی نشانے پر ہے اور اس جنگ میں ایک بار پھر نادان ملا کا طرز فکر و عمل مغربی حیلہ گری کا ممد و معاون ثابت ہو رہا ہے۔

مغرب کی حیلہ گری کا ایک اور بڑا مظہر اخلاقی اقدار کو اقتصادی مسائل سے بالکل الگ کر کے دیکھنے کی روش تھی۔ یہی کیپیٹل ازم کا امتیاز بھی تھا اور ہے اور اس کو اقبال حکمتِ فرعونی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ زندگی کو ایک جامع اکائی کے طور پر محض 'دکان' اور 'منافع' کے پیمانے سے نہیں ناپا جا سکتا۔ فلسفہ سیاست و ریاست کی وہ تمام صورتیں جو خدا کی بستی کو دکان سمجھ کر حصول زر کو ہی حیات انسانی کا اساسی مقصد خیال کرتی ہوں، اقبال ان سب سے بے زار ہے۔ ایک صدی پہلے کچھ ایسی ہی صورت حال کے خلاف اقبال نے اعلان جنگ کیا تھا۔

اقبال اس بات کا گہرا شعور رکھتے تھے کہ مسلمانانِ عالم اور بالخصوص مسلمانانِ مشرق کے مستقبل کا انحصار انہی خطرات کے مقابل اختیار کئے گئے طرز فکر و عمل پر ہے۔ اقبال کے ہاں ان بڑے خطرات کے احساس کی اپنی ایک تاریخ ہے اس کا ایک سراغ تو ہمیں ان کے ۱۹۰۴ء کے مضمون 'قومی زندگی' میں ملتا ہے۔ اقبال اس مضمون میں

لکھتے ہیں کہ:

''یہ بدقسمت قوم حکومت کھوبیٹھی ہے، صنعت کھوبیٹھی ہے' تجارت کھوبیٹھی ہے۔اب وقت کے تقاضوں سے غافل اور افلاس کی تیز تلوار سے مجروح ہو کر ایک بے معنی توکل کا عصا ٹیکے کھڑی ہے۔''(۱)

بے معنی توکل کا عصا ٹیک کر کھڑی اس قوم کے مذہب کا اس کی اجتماعی زندگی میں کیا کردار ہے؟ اس مضمون میں اقبال لکھتے ہیں کہ:

''۔۔۔۔۔۔اور باتیں تو خیر، ابھی تک ان کے مذہبی نزاعوں کا ہی فیصلہ نہیں ہوا۔آئے دن کے ایک نیا فرقہ پیدا ہوتا ہے جو اپنے آپ کو جنت کا وارث سمجھ کر باقی تمام نوع انسانی کو جہنم کا ایندھن قرار دیتا ہے۔غرض کہ ان فرقہ آراہیوں نے خیرالامم کی جمعیت کو کچھ ایسی بری طرح منتشر کر دیا ہے کہ اتحاد و یگانگت کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔مولوی صاحبان کی یہ حالت ہے کہ اگر کسی شہر میں اتفاق سے دو جمع ہو جائیں تو حیات مسیح وآیات ناسخ ومنسوخ پر بحث کرنے کے لیے باہمی نام و پیام ہوتے ہیں۔

اور اگر بحث چھڑ جائے اور بالعموم چھڑ جاتی ہے، تو ایسی جوتیوں میں ڈال بٹتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ پرانا علم وفضل جو علمائے اسلام کا خاصہ تھا نام کو بھی نہیں۔ہاں مسلمان کافروں کی ایک فہرست ہے کہ اپنے دست خاص اس میں روز بروز اضافہ کرتے رہتے ہیں۔''(۲)

گویا اسلام کی نمائندگی نہایت نااہل، عاقبت نااندیش اور نادان مولوی صاحبان کے پاس تھی۔ یہ مولوی صاحبان مسلمانوں کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی تربیت تو کیا کرتے' اخلاقی تربیت کرنے کی اہلیت بھی اپنے اندر نہیں رکھتے تھے۔علی گڑھ میں ۱۹۱۰ء میں دیئے گئے اپنے خطبے میں اقبال بڑے ہی تاسف کے ساتھ اس طبقے کا ذکر کرتے ہیں:

"You know that the ethical training of the messes of our community is principally in the hands of a very inefficient class of Moulvies or public preachers, the range of whose knowledge of Muslim history and literature is extremely limited."(۳)

ایسے مولوی صاحبان کا کردار کسی صورت عملی زندگی کے حد درجہ بے رحمانہ مسائل ومصائب کے مقابل مذہب کی اہمیت ومعنویت کو ثابت کرنے میں ناکام رہا تھا۔انہوں نے اپنے مذہب کو حوادثِ زمانہ سے محفوظ رکھنے کے لیے اسے اپنی نادانی، کم علمی اور کم فہمی کے حصار میں لے رکھا تھا۔اقبال اس مولوی، ملّا اور واعظ سے نالاں ہیں۔

اقبال کو اس بات کا گہرا شعور تھا کہ ملاّ کی یہ نادانی اپنے اثرات کے اعتبار سے خود اس ذات تک محدود نہ رہے گی بلکہ پھیل کر پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ اقبال نے اپنی معروف اور موثر طویل نظم 'جواب شکوہ' کے بے مثال طرز استدلال کا محور بھی واعظ قوم کی پختہ خیالی سے دوری کو بنایا تھا کہ اس وجہ سے مسلمان وضع میں نصاریٰ اور تمدن میں ہنود نظر آنے لگے تھے۔ اس رویے نے ترقی کی اور یہاں تک سوچا جانے لگا کہ شاید زمانے کے تقاضوں کے ہم رکاب چلنے کے لیے مذہب کو عملی زندگی سے یکسر خارج ہی کر دینا چاہیے۔ ایسی فضا کی تشکیل میں دیگر کے علاوہ مسلمانوں کی سیاسی غلامی' فرنگ کے قومیت و وطنیت کے تصورات نیز مغرب میں عیسائیت کے بطور مذہب تجربے اور عملی زندگی سے اخراج کے پس منظر نے بھی گہرا حصہ لیا۔ ۱۹۳۰ء کے خطبہ الٰہ آباد میں جب اقبال یہ کہتے ہیں کہ:

> "Never in our history has Islam had to stand a great trial than the one which confront it today. It is open to a people to modify, reinterpret or reject the foundational principles of their social structure, but it is absolutely necessary for them to see clearly what they are doing before they undertake to try a fresh experiment."(۴)

تو صاف نظر آتا ہے کہ انہیں مسئلے کی سنگینی کا ادراک ہے۔ انہوں نے اپنی کمیونٹی کے سامنے ایک غیر مبہم سوال رکھا اور صاف صاف بتا دیا کہ مسلمانوں کے آئندہ سیاسی' سماجی اور معاشی مستقبل کا انحصار اسی سوال کے راست جواب میں مضمر ہے۔ وہ سوال یہ تھا:

> "Is religion a privat affair? would you like to see Islam as a moral and political ideal, meeting the same fate in the world of Islam as christianity has already met in Europe? "Is it possible to retain Islam as in ethical idea and to reject it as a polity in favour of national politics, in which religious attitude is not permitted to pay any part?"(۵)

ہم دیکھتے ہیں کہ برصغیر میں مسلمانوں کے اجتماعی سیاسی وسماجی وجود اور جداگانہ تشخص کے تحفظ کا اہتمام اسی سوال کے درست تجزیے اور صحیح جواب کے باعث ممکن ہوا۔ حیرت انگیز لیکن افسوسناک امر یہ ہے کہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی کا سوال اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کے اواخر میں اپنی کم وبیش اسی پرانی صورت میں ہمارے

سامنے موجود ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ بیسویں صدی کے اوائل میں ہمارا مذہب اسلام ہمارے اجتماعی وجود کے لیے تقویت کا باعث بنا تھا اور آج اکیسویں صدی کے آغاز میں ہمارے مذہب اسلام کو ہمارے لیے سب سے بڑی کمزوری بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ایک صدی پہلے اسلام ہمارے مسئلے کا حل تھا، جبکہ آج یہ ہمارے مسئلے کا حصہ بنادیا گیا ہے۔اس سے پہلے کہ ہم اس بات کا جائزہ لیں کہ اسلام ہمارے لیے کمزوری کا عنوان کیسے بنا، آیئے دیکھتے ہیں کہ پچھلی صدی میں اقبال نے اس صورت حال میں کیا رہنمائی کی تھی اپنے صدارتی خطبے کے آخر میں اقبال نے کہا تھا کہ:

> "Pass from matter to spirit. Matter is diversity; spirit is light, life and unity.One lesson I have learnt from the history of Muslims. At critical moments in their history it is Islam that has saved Muslims and not vice versa. If today you focus your vision on Islam and seek inspiration from the ever-vitalising idea embodied in it, you will be only reassembling your scattered forces, regaining your lost integrity, and thereby saving your self from total destruction."(۲)

مشکل وقتوں میں اسلام مسلمانوں کی اجتماعی ہستی کی حفظ وبقا کا اہتمام کرتا ہے، اقبال کے اس تاریخی شعور سے لبریز تجزیے نے پچھلی صدی میں مسلمانانِ برصغیر میں زندگی کی ایک تازہ روح پھونک دی تھی۔لیکن بدقسمتی دوطرح سے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ایک یہ کہ پڑھے لکھے متوسط درجے کے عام مسلمانوں کے متوازی قدیم مذہبی تعلیم کے حامل ملاؤں کی جماعت اپنا اثر ورسوخ بڑھاتی رہی۔تحریک پاکستان کے دوران اپنی تمام ترسعی کے باوجود یہ جماعت مسلمانوں کی اجتماعی تقدیر کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکی لیکن قیام پاکستان کے بعد یہ مذہبی طبقات جاگیرداروں، عسکری اشرافیہ اور فرنگی ساحروں کے مستقبل کے اغراض کی تکمیل کے لیے دانستہ اور نادانستہ مدد دینے کے وعدے پر نو آزاد مملکت کے جملہ کاروبار حیات پر قابض ہوگئے اور دین کی تعبیر کرنے والے عالم فکر اسلامی کے تحرک کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑے ہوگئے۔دوسرے اقبال نے الہیٰات اسلامیہ کی تشکیل جدید کی جس ضرورت کی طرف توجہ دلائی تھی، اسے ملاّ کے قہروغضب نے روبہ عمل نہ آنے دیا۔ستم یہ دیکھیے کہ صرف اس خوف سے کہ اُردو دان طبقہ Reconstrution کے خطبات کو صحیح تناظر میں شاید نہ سمجھ سکے، اقبال کی وفات کے بیس برس بعد تک سید نذیر نیازی کا نہایت وقیع اور معتبر اُردو ترجمہ شائع نہ ہوسکا، اور ہوا بھی تو ان خطبات کے مطالبات کی طرف

وہ توجہ نہ دی گئی جس کی آرزو اقبال رکھتے تھے۔ تشکیل جدید کے خطبات کے حوالے سے تنگ نظر اور سخت گیر ملاّ اس مسئلے سے آگے نہیں بڑھ سکا کہ بی اے میں عربی کے مضمون میں گولڈ میڈل حاصل کرنے والے اور لندن یونیورسٹی میں اپنے استاد پروفیسر آرنلڈ کی جگہ، ان کی غیر موجودگی میں متبادل استاد کے طور پر عربی پڑھانے والے اقبال کو عربی زبان آتی تھی یا نہیں؟ ملاّ کا یہ سوال سوئی کی نوک پر بیک وقت بیٹھ سکنے والے فرشتوں کی تعداد والے سوال سے ملتا جلتا ہے۔ دونوں سوال بے معنی اور اصل سوال یا سوالات سے گریز کی ایک شکل ہیں۔ اقبال کی عربی دانی پر سوالات اٹھانے والے اقبال شناسوں نے آج تک یہ سوال نہیں اٹھایا کہ بعض فاضل علماء کہ جو خطبات کی اشاعت پر مبینہ طور پر نالاں رہے، کو انگریزی زبان آتی تھی؟ میں جانتا ہوں کہ یہ سوال بھی کسی بامقصد علمی بحث کا عنوان نہیں بن سکتا لیکن اس سوال کی بے مقصدیت پہلے سوال کی حقیقت کو آشکار کر دیتی ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا اسلام کی ہیت میں حرکت اور تغیر کا کوئی اصول وجود رکھتا ہے یا نہیں؟ اگر ایسا تصور وجود رکھتا ہے تو پھر اسے روبہ عمل لانے میں کیا امر مانع ہے۔ کیا روزمرہ معاملات کے متعلق حاصل کئے جانے والے یا دیئے جانے والے فتاویٰ اجتہاد مطلق کا متبادل ہو سکتے ہیں؟ کیا ہماری اجتماعی زندگی اپنے اصول میں تحرک کی موجودگی کے ثمرات سے فائدہ اٹھا سکتی ہے؟ اگر ہم اسلام کے بارے میں اپنے تصورات کو مستحکم و متوازی نہیں بنائیں گے، اگر ہم اجتہاد کو محض ایک علمی مسئلہ خیال کرتے ہوئے ایک عملی معاملہ سمجھنے کی طرف مائل نہیں ہوں گے تو دورِ حاضر میں مذہب ہمارے لیے تقویت کا باعث بننے کی بجائے ضعف و ناتوانی کا عنوان بن جائے گا۔

ضرب کلیم، جو دورِ حاضر کے خلاف اقبال کا اعلان جنگ ہے، کے حصے 'اسلام اور مسلمان' میں اقبال کی ایک نظم 'اجتہاد' قابل غور ہے:

ہند میں حکمتِ دیں کوئی کہاں سے سیکھے
نہ کہیں لذتِ کردار نہ افکارِ عمیق
حلقہ شوق میں وہ جراتِ اندیشہ کہاں
آہ! محکومی و تقلید و زوال تحقیق
خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق!

(اجتہاد۔ضرب کلیم)

اقبال نے فقیہان حرم کی اس بے توفیقی، محکومی وتقلید وزوال تحقیق کے خلاف اعلان جنگ کیا تھا۔ میں آج آپ کے سامنے یہ سوال رکھنا چاہتا ہوں کہ دورحاضر میں بھی یعنی اکیسویں صدی کے آغاز میں اقبال کا ایک صدی پہلے والا اعلان اسی طرح موثر ہے یا نہیں۔ کیا محکومی، تقلید، زوال تحقیق اور فقیہان حرم کی بے توفیقی میں کچھ فرق آیا ہے؟ ضرب کلیم ہی کی ایک اور نظم پر توجہ مناسب رہے گی، عنوان ہے 'اے پیر حرم'

اے پیر حرم رسم و رہِ خانقہی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے ان کو سبق خود شکنی ' خود نگری کا
تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے
مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

لیکن قریباً ایک صدی کا تجربہ یہ باور کراتا ہے کہ پیرحرم اپنا طرز عمل تبدیل کرنے پر آمادہ وتیار نہیں ہے۔تو کیا ہم پیرحرم کو اسلام کا اجارہ دار تسلیم کر سکتے ہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو پھر ہمیں اقبال کے اعلان جنگ کی اہمیت اور عصری معنویت پر غور کرنا ہوگا۔اس ضمن میں ہمیں فکر اقبال کی روشنی میں کچھ اقدامات کی طرف توجہ دینی ہوگی۔ اقبال کو اس امر کا بڑی شدت کے ساتھ احساس رہا کہ مسلمان اکثریت کے ملک یا معاشرے کو فرقہ وارانہ بنیادوں پر قائم مذہبی گروہوں یا مذہبی سیاسی جماعتوں کے تصورات کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔اسلام کی حقیقی روح آزاد خودمختار زندگی کے بدلتے تقاضوں اور جدید علوم وفنون کی تعلیم' ایجادات کے اثرات اور نتائج سے حقیقی طور پر آشنا مسلمان معاشرے کے اجتماعی ذہن میں آشکارہ ہوسکتی ہے۔ نہ اجتماعی بصیرت سے کٹے ہوئے اور قدامت کے حصار میں گرفتار مذہبی رہنما، کہ جنہوں نے نادانستہ طور پر سہی اسلام میں بھی ایک طرح کا 'کلیسا' قائم کرلیا ہے کہ جس کی اطاعت بہرطور لازم ہو۔اس وقت پاکستان میں بدقسمتی سے فرقہ وارانہ بنیادوں پر استوار اور شریعت اسلامی کے اپنے اپنے اور بسا اوقات ایک دوسرے سے متحارب تصورات رکھنے والے مذہبی گروہ قائم اور مصروف ہیں۔ انہوں نے، حیرت انگیز حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اکثریت کے ملک کو اسلام کے نام پر یرغمال بنانے کی کوشش شروع کر رکھی ہے، بے لچک موقف، اسلام کے بارے میں ناپختہ تصورات اور ہلاکت خیز اسلحے کی منطق، یہ ان مذہبی گروہوں کا کل اثاثہ ہے انہیں در پردہ ان عناصر کی سرپرستی، تائید اور حمایت حاصل ہے جو پاکستان میں ایک آزاد خودمختار جمہوری اور

فلاحی معاشرے کے قیام کے امکان تک ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ اقبال نے اس طرح کی آزاد و خود مختار ریاست کے قیام کا خواب تو نہیں دیکھا تھا۔ ان حالات میں فرقہ وارانہ بنیادوں پر استوار اور مذہب کے نام پر سیاست کرنے والی تمام جماعتوں پر پابندی عائد کی جانی چاہیے۔ ایک مسلمان معاشرے کی ہر سیاسی جماعت، مسلمانوں میں ایک رائے کی علمبردار ہوتی ہے۔ مسلمان اکثریت کے ملک میں کسی سیاسی جماعت کا 'اسلامی' کہلوانا بھی مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ اس طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ یہاں اس بات کی صراحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اقبال کا دورِ حاضر کے خلاف اعلانِ جنگ صرف نادان ملاّ کے ناقص تصورِ اسلام کے خلاف ہی اعلانِ جنگ نہیں تھا، اس اعلانِ جنگ کے دیگر پہلو بھی تھے۔ ان میں دو پہلو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، ایک غرب زدگی یعنی مغرب پرستی کے خلاف اعلانِ جنگ اور دوسرے عرب زدگی یعنی اسلام کو عرب ملوکیت و شہنشاہیت کے اثرات سے پاک کرانا نیز عرب قوم پرستی کے ملتِ اسلامیہ پر افتراق آمیز اثرات کا خاتمہ۔ مسلمانانِ برصغیر کے لیے ایک علیحدہ' آزاد اور خود مختار ریاست کا مطالبہ کرتے ہوئے اقبال نے کہا تھا کہ اس آزاد مسلم ریاست کے قیام سے:

> "..... for Islam an apportunity to rid itself of the stamp that Arabian imperialism was forced to give it, to Mobilize its law, its education, its culture, and to bring them into closer contact with its own original spririt and with the spirit of modern times."(۷)

اقبال تو اسلام کے روشن چہرے کو عرب شہنشاہیت و ملوکیت کی گرد سے پاک کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے اور دوسری طرف عصرِ اقبال میں فرنگی تخیلات کے زیرِ اثر فکرِ عرب نے نسل پرستی کی روش اپنا کر گویا روحِ اسلام کو حجاز و یمن سے نکال باہر کیا(۸) اور گویا کیفیت یہ ہوئی کہ:

حکمت مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

(خضرِ راہ' بانگِ درا)

خلافتِ اسلامیہ کے خلاف افرنگ کی تائید و حمایت کے ساتھ عرب قوم پرستی نے عالمِ اسلام کو جس طرح ٹکڑوں میں تقسیم کیا، عالمِ اسلام آج تک اس کے پیدا کردہ مصائب و مشکلات سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکا۔ عربوں کے اس سیاسی طرزِ عمل نے اسلام کی وحدت خیز قوت کو مجروح کر کے رکھ دیا اور وہ اس حقیقت کو فراموش کر بیٹھے جس کی طرف اقبال بارہا متوجہ کرتے ہیں کہ:

> "..... Islam is neither Nationalism nor imperialism but a

league of Nations which recognize artificial bourdaries and recial disinctions for facility of reference only, and not for restricting the social horizon of its members."(۹)

مقام افسوس ہے کہ دورِ حاضر میں بھی عالم عرب ملوکیتوں کے زیر تصرف ہے اور یہ سمجھنے سے قطعاً قاصر ہے کہ وصالِ مصطفوی کا لازمی مطلب افتراق ہو بھی ہوا کرتا ہے نا کہ امتزاج بولہبی (۱۰)

اقبال عالم اسلام میں نسلی و وطنی قوم پرستی کے رجحان کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہیں۔ دورِ حاضر میں یہ جنگ اپنی پوری معنویت کے ساتھ جاری وساری ہے۔ اقبال نے اپنی معروف مثنوی 'پس چہ باید کرد اے اقوام شرق' میں ملتِ عربیہ کے رخ اور رجحان پر ایک عنوان وقف کیا ہے۔ حرف چند با امت عربیہ' اس عنوان کے تحت اقبال عربوں کو ان کے شاندار ماضی کا حوالہ دیکر حال کے فتنۂ افرنگ سے متنبہ کر رہے ہیں:

اے ز افسونِ فرنگی بے خبر
فتنہ ہا در آستینِ او نگر
حکمتش ہر قوم را بے چارہ کرد
وحدتِ اعرابیاں صد پارہ کرد
تا عرب در حلقہ دامنش فتاد
آسماں یک دم اماں او را نداد

(حرفے چند با امتِ عربیاں' پس چہ باید کرد اے اقوام شرق)

دورِ حاضر میں دنیائے اسلام کے اجتماعی مصائب کا خاتمہ کرنے کے لیے اولین قدم کے طور پر مسلمان ممالک میں ملوکیت' شہنشاہیت اور ہر طرح' شخصی آمرانہ حکومتوں کی جگہ رائے جمہور سے قائم آزاد و خود مختار حکومتوں کے قیام کو ممکن بنانا ہوگا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد استعمار سفید کی تائید و حمایت سے وجود میں آے والی عرب بادشاہتوں کو رضا کارانہ طور پر اقتدار سے دستبردار ہو کر اقتدار عوام کے حوالے کر دینا چاہیے۔ ایسی صورت میں اس بات کا امکان موجود ہے کہ بعض مسلمان ممالک کے عوام ان بادشاہوں کے علامتی وجود کو برقرار رکھنے پر غور کریں۔ عرب بادشاہتیں ماضی میں بھی نا قابل اعتبار اور قوتِ کار کے اعتبار سے بے کار ثابت ہو چکی ہیں ان کا واحد مقصد اپنے اقتدار کو کسی بھی قیمت پر قائم رکھنا اور اس مقصد کے لیے کسی بھی قیمت پر معاونت کرنے والے ساحرانِ افرنگ کے احکام کی تعمیل کرنا رہ گیا ہے یہ کوئی تازہ واردات یا رجحان نہیں ہے۔ اقبال کے دور میں بھی یہی صورت حال تھی۔ ۲۶ر جولائی ۱۹۳۷ء کو مسئلہ فلسطین پر ایک بیان میں اقبال نے نہایت دردمندی سے عربوں کو ایک مشورہ دیا تھا۔

میرے نزدیک عالم عرب کے لیے یہ مشورہ آج بھی اپنی معنویت اور افادیت کے اعتبار سے اہم ترین ہے۔ اقبال نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ:

''عربوں کو چاہیے کہ اپنے قومی مسائل پر غور وفکر کرتے وقت عرب ممالک کے بادشاہوں کے مشوروں پر اعتماد نہ کریں۔ کیونکہ بحالات موجودہ ان بادشاہوں کی حیثیت ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ وہ محض اپنے ضمیر اور ایمان کی روشنی میں فلسطین کے متعلق کسی صحیح فیصلے یا کسی صائب نتیجہ پر پہنچ سکیں۔''(۱۱)

اگر عرب بادشاہوں نے دستبرداری اختیار نہ کی تو غالب امکان ہے کہ ان مسلمان ممالک کو انقلابات میں سے گزرنا پڑے، لیکن انقلاب کے رخ کا اندازہ قائم کرنا ممکن نہیں ہوتا، انقلاب کا باعث بننے والے، انقلاب کو روبہ عمل لانے والے اور انقلاب کے ثمرات سے فائدہ اٹھانے والے ہمیشہ مختلف ہوتے ہیں۔ اور ایک یہی پہلو انقلاب کا ایسا ہے جسے کسی بھی انقلاب کا حقیقی المیہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

ایک صدی پہلے اقبال نے اقوامِ مغرب کی اسلحہ کے زور پر روبہ عمل آنے والی منطق کو حکمتِ فرعونی قرار دیا تھا حکمتِ فرعونی کا سب سے بڑا اور موثر ہتھیار دہشت گردی ہے۔ اقبال اپنی مثنوی 'پس چہ باید کرد' میں اس حکمتِ فرعونی کے ملت اسلامیہ کے لیے طریقہ واردات کی صراحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

حکمتِ ارباب کیں مکر است و فن
مکر و فن؟ تخریبِ جاں تعمیرِ تن!
مکتب از تدبیر او گیرد نظام
تا بکامِ خواجہ اندیشد غلام
شیخ ملت با حدیث دلنشیں
بر مرادِ او کند تجدید دین
از دم او وحدت قومے دو نیم
کس حریفش نیست جز چوبِ کلیم
وائے قومے کشتۂ تدبیر غیر
کار او تخریبِ خود تعمیر غیر

مغرب کے دہشت گردی پر مبنی اس نظامِ عالم میں مسلمان اقوام کے لیے خیر کی کوئی خبر پنہاں نہیں ہے۔ بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں اقبال محسوس کر رہے تھے کہ جہانِ پیر کی موت قریب آ چکی ہے اور قافلہ

شرق و غرب انقلاب کی دہلیز پر کھڑا ہے، لیکن انقلاب کے رخ اور مزاج کو طے کرنے میں اقوام ایشیا بالعموم اور مسلمانانِ عالم بالخصوص کوئی کردار ادا کرنے کے لیے آمادہ و تیار نہیں تھے۔ ترکی اور ایران کے تغیّرات اقبال کے سامنے تھے۔ ترکی کے رویے اور رخ کو اقبال سراہتے بھی ہیں، لیکن مجموعی طور پر وہ مصطفیٰ اور رضا شاہ کو روحِ شرق کا نمائندہ خیال نہیں کرتے۔ مشرقِ وسطیٰ کی سیاسی تقسیم نو کو بھی محتاط تجزیے کا عنوان بنانا ضروری ہے ورنہ جو خطرناک صورت حال اس وقت پاکستان کو بالخصوص عالم اسلام کو بالعموم درپیش ہے، اس سے نکلنے کی تدبیر سجھائی نہیں دے گی۔ ہمیں اپنی جنگ اور اپنے میدان جنگ کا انتخاب خود کرنا چاہیے۔ دوسروں کی جنگ اور اپنے صحن کو میدان جنگ بنا کر ہم، بالآخر کچھ بھی حاصل نہ کر پائیں گے۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ ہمارے مذہب اور اس کی مختلف تعبیروں کو اس جنگ کا ایندھن بنایا جا رہا ہے اور یہ بجائے خود ایک نہایت خطرناک روش ہے۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے آغاز میں مغرب کو مکالمے کی دعوت دینے والا۔ (۱۲)

۱۹۳۶ء میں عصر حاضر کے خلاف اعلان جنگ کیوں کر رہا ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے حالات و واقعات جس سمت رواں دواں تھے اس میں مسلمانانِ عالم کے پاس وہ بنیاد موجود نہ رہی تھی جس پر مکالمہ استوار ہوتا ہے۔ وہ بنیاد تھی علم و عمل کی طاقت، جس کو اقبال حکمت کلیمی اور ضرب کلیم قرار دیتے ہیں، اقبال کی اس ضمن میں پختہ تر رائے یہ تھی کہ:

عصا نہ ہو تو کلیمیؑ ہے کار بے بنیاد!

مسلمانانِ عالم کو علم اور عمل کی دنیا میں اپنے حصے کو مستحکم اور اپنے کردار کو موثر کرنے کی تدبیر کرنا ہوگی اور اس اُصول کو ذہن میں رکھنا ہوگا کہ محبت اور نفرت کا انتخاب نہایت دانشمندی کا تقاضا کرتا ہے۔ کب تک مسلمانانِ عالم اقوام مغرب کی حیلہ گر جنگوں کا ایندھن بنتے رہیں گے؟۔ ہمارا طرز فکر و عمل جنگ نہیں، امن ہونا چاہیے کہ یہی، دراصل اسلام ہے۔

حواشی/حوالے

۱۔ عبدالواحد (مرتبہ) قومی زندگی، مشمولہ: مقالاتِ اقبال، لاہور: آئینہ ادب، باردوم، ۱۹۸۸ء، ص ۸۷

۲۔ ایضاً، ص ۸۷-۸۸

3- The Muslim Community, a Sociological Study, Discourses of Iqbal, Compiled and Edited by Shahid Hussain Razzaqi (Lahore: Iqbal Academy, 2nd edition, 2003) P:62

4- Presidential Address to the All India Muslim Leege, Discourses of Iqbal, P:78,79

5- Presidential Address to the All India Muslim Leege, Discourses of Iqbal, P:79

6- Presidential Address to the All India Muslim Leege, Discourses of Iqbal, P:99,100

7- Discourses of Iqbal,P:84

۸۔ ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام، ضرب کلیم، ص ۶۰۸

فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیّلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو!

9- Muhammad Iqbal, The Reconstruction of Religious Thought in Islam, P:126

۱۰۔ نظم بعنوان 'امرائے عرب سے' ضرب کلیم، ص ۵۲۵-۵۲۶

کرے یہ کافرِ ہندی بھی جراتِ گفتار اگر نہ ہو امرائے عرب کی بے ادبی
یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا کس امت کو وصال مصطفویؐ، افتراقِ بولہبی!
نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا محمدؐ عربی سے ہے عالمِ عربی!

۱۱۔ پیام مشرق، ۱۹۲۳ء

۱۲۔ رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو کلیمیؑ ہے کارِ بے بنیاد!

(بالِ جبریل)